حجت الاسلام سید حسن عباس فطرت (پونہ)

امام خمینیؒ اور امت اسلامیہ کی قیادت

عظیم اسلامی انقلاب کے عظیم الشان قائد، جمہوری اسلامی ایران کے بانی، جہانِ اسلام کے پیشوا امام امت حضرت سیّد روح اللہ الموسوی الخمینی قدس سرہ الشریف کی جان سوز و دلگداز وفات حسرت آیات کو سولہ سال ہو چکے ہیں لیکن اس طرۂ دستار اسلام وفرزند زہرا نے اپنی پرشفقت و پرمحن طویل مجاہدانہ قیادت کے آخری دنوں میں ایسے دو اہم اقدام کیے کہ ہمیں لگتا ہے کہ آج ان معنوی وجود کا آفتاب مادّی وجود کے ماہتاب سے بھی زیادہ تابناک ومنور ہوکر عالم اسلام کو متجلی، توانا وہشیار بنائے ہوئے ہے۔ کم وبیش یہی زمانہ تھا جبکہ ہمارے محبوب وفقید امام نے مادّیت کے سب سے بڑے پجاری ومہنت کو ایک زلزلہ افگن تاریخی پیغام بھیجا تھا جس کی جرأت مردانِ الٰہی کے سوا کوئی اور نہ کرسکتا تھا۔ اس پیام میں روسی رہنما کورباچوف کو پیمبرانہ اسلوب میں حیاتِ بشری میں معنویت و روحانیت کی اہمیت بتائی گئی تھی اور بڑے مشفقانہ مگر منطقی انداز میں ان کو اسلام کے مطالعہ کی دعوت دی گئی تھی ساتھ ہی یہ پیشین کوئی بھی کی گئی تھی کہ عنقریب کمیونزم تاریخ کے میوزیم میں محدود ہوکر رہ جائے گا اور اس کا کلیدی سبب عقیدۂ خداپرستی وروحانیت کا فقدان ہے۔ اس عظیم ومنفرد مہم میں تاریخِ اسلام کے طول وعرض میں وہ پیغمبرِ اسلامؐ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے والے تنہا ایک رہبر ملتے ہیں غالباً کل بھی ان کی نظیر نہیں مل سکے گی۔ ابھی اس ندائے دعوت وبشارت کی گونج باقی ہی تھی کہ اس نظیر امت کے لیے آزمائش کی دوسری منزل سامنے آگئی جو اس سے بھی کٹھن تھی۔ اس کے نتائج وعواقب سے بھی حضرت امامؒ آگاہ تھے لیکن جب آپ نے دیکھا کہ سلمان رُشدی کی کفرآمیز کتاب سے مسلمانوں میں بے چینی و انتشار کا طوفان اُٹھ رہا تھا اور اس منحوس کتاب ''شیطانی آیات'' کے

خلاف مسلمانوں نے جان و مال کی بازی لگادی تھی تو آپ سے نہ رہا گیا اور آپ بھی امت کے اس جوش وخروش میں شامل ہوگئے اور اپنے تاریخی فتوے سے صورِ اسرافیل کا کام لیا جس سے دشمنانِ اسلام کا دَم نکل گیا اور مسلمانوں کو حیاتِ نو مل گئی۔ حضرت امامؒ نے کتاب ''شیطانی آیات'' کے دل آزار متن اور مسلمانانِ عالم کے بڑھتے ہوئے ہیجان کو ملاحظہ فرمایا اور سوچ سمجھ کر اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے بڑی جرأت وصلاحیت کے ساتھ حکم دیا:

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون

دنیا بھر کے غیرت مند مسلمانوں کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ ''شیطانی آیات'' نامی کتاب جو اسلام، پیغمبر اور قرآن کے خلاف لکھی، چھپی اور شائع کی گئی ہے اس کے مؤلف اور کتاب کے مواد ومضمون سے باخبر ناشر کی سزا موت ہے۔ میں غیرت مند مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ ان افراد کو جہاں کہیں پائیں جلد از جلد موت کے گھاٹ اُتار دیں تا کہ پھر کسی میں، مسلمانوں کے مقدسات کی توہین کرنے کی جرأت پیدا نہ ہو۔ اس (حکم کے نفاذ کی) راہ میں قتل ہونے والے افراد شہید ہیں انشاء اللہ۔ اگر کوئی شخص مؤلف تک رسائی رکھتا ہے، لیکن اسے سزائے موت دینے کی خود اس میں توانائی نہیں ہے تو وہ عوام کو اس کا ٹھکانہ بتائے تا کہ وہ اپنے کیفرکردار تک پہنچ جائے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

روح اللہ الموسوی الخمینی

۸ رجب المرجب ۱۴۰۹ھ

اس فتوے نے ساری دُنیا کے سمندر میں طغیان پیدا کردیا اور مشرق سے مغرب تک ایک سنسنی پھیل گئی اور زخم خوردہ مسلمانوں کے دل کو مرہم مل گیا۔ برطانوی حکومت اور دوسرے غیرمسلم ممالک کے افراد حکومت نے اس فتویٰ پر جو ردِّعمل ظاہر کیا اس کی تو کسی حد تک توقع بھی تھی لیکن مسلم ممالک و اشخاص کی خاموشی اور استہزا نہ صرف قابلِ حیرت بلکہ لائقِ تعزیر و ملامت

بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس فتوے کے بعد دُنیائے اسلام کے غیرت دار مسلمانوں نے حضرت امام خمینیؒ کی رہبریت کو صدق دل سے قبول کرلیا اور ان کے بدخواہوں کے قدموں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ آج بھی امامؒ کا فتویٰ زندہ و برقرار ہے اور رُشدی کے طرفداروں کو کچل رہا ہے۔ مغربی ممالک میں اب ایسے قوانین بن رہے ہیں جس کے تحت پیغمبرِ اسلامؐ کے حضور میں ہر چھوٹی بڑی گستاخی کو جرم قرار دیا جارہا ہے۔

حضرت امام خمینیؒ کی حیاتِ طیبہ کے آخری دَور کے ان دو واقعات کا ذکر صرف بیانِ واقعہ کے طور پر نہیں کیا گیا بلکہ بتانا یہ ہے کہ ہماری دنیا میں امام امت ہی ایک ایسے منفرد رہبر تھے جن پر ماحول، وقت، زمانہ، تقاضائے عمر، مصلحت، رعایت جیسے عوامل اثر انداز نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ ارمان و حرکت و عمل سے بھرے ہوئے پرشور ایام شباب میں امام فقید نہایت خاموشی اور متانت کے ساتھ حالات کا بغور مشاہدہ کرتے نظر آتے ہیں۔ درس و مطالعہ کے سوا ان کا کوئی قول و عملی کردار بعثت و انقلاب کی راہ میں دکھائی نہیں دیتا۔ آج سے ستر پچھتر سال قبل وہ اپنے اساتذہ کے چہیتے اور قابلِ فخر شاگرد تھے اور ان کی صلاحیت و استعداد کا شہرہ تھا۔ اس کے بعد وہ فلسفہ و اخلاق، سیر و سلوک و عرفان، تفسیر و حدیث و فقہ اور اجتہاد کے درس میں نمایاں و ممتاز حیثیت کے مالک اور اپنے بزرگ علماء کے معتمد اور مشاور تھے۔ ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی مگر عملی اقدام سے وہ خود کو الگ رکھے ہوئے تھے اگرچہ تمام انقلابی علماء اور رہنماؤں سے ان کا ربط تھا لیکن باقاعدہ وہ کسی سے ملحق نہیں ہوئے تھے البتہ اگر اس زمانے کی تحریر، تقریر، درس و تصنیفات کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو لگتا ہے آپ کو آنے والے زمانے میں اپنی مسئولیت و رسالت کا احساس تھا اور جس طرح درخت کے بیج میں پورا درخت چھپا ہوتا ہے اور وہ زیرِ زمین جانے کے مدتوں بعد چھتنار ہوکر پھیلتا ہے اور اسی وقت اس کی تمام خاصیت و کیفیت و منفعت حواسِ خمسہ سے محسوس کی جاتی ہے۔ اسی طرح ساٹھ کی دہائی کے بعد حضرت امام خمینیؒ نے حکومت اسلامیہ، ولایت فقیہ، عدلیہ و انتظامیہ و مقننہ کا جو تفصیلی و منضبط خاکہ پیش کیا اور

انقلاب کی کامیابی کے بعد اسے عملی جامہ پہنا کر دنیائے عرب و شرق کو چکاچوند و حیرت زدہ کر دیا اس کا بنیادی تصور ان کی ابتدائی تصنیفات میں موجود ہے جس میں ایک کتاب ''کشف اسرار'' ہے جو انقلاب سے پچاس سال قبل لکھی گئی۔

''کشف اسرار'' نہایت جامع و پرحکمت کتاب ہے۔ اگرچہ وہ ایک مخالف اسلام، پہلوی حکومت کے پالتو کتے کی بک بک بنام ''اسرار ہزار سالہ'' کے جواب میں لکھی گئی ہے اور اس وقت جبکہ بعض وجوہ سے کوئی اس کارِ اہم کے لیے آگے نہیں بڑھا تو حضرت امامؒ نے مرض چشم کے ہوتے ہوئے اس قلمی جہاد پر کمر کس لی اور اسلامی و جعفری عقائد کو آیاتِ قرآنی، فلاسفہ کے بیانات اور محکم و مسکت دلائل و شواہد کے ساتھ پیش کرتے ہوئے نا ہنجار رضا خان کی حکومت کی اسلام شکن حرکات اور جبر و استبداد و وحشیانہ پن کو بھی بڑی خوبصورتی سے اُجاگر کیا۔ عصرِ حاضر کے چند کم نظروں اور فتنہ پروروں نے کتاب مذکور کے بعض اجزاء کو ان کے سیاق و سباق سے جدا کر کے امامؒ کی شخصیت کو داغدار بنانے کی ناکام کوشش کی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت امام خمینیؒ کی بے تاب رُوح اسلام پرستی اور انقلابی افکار کے تانے بانے کو نزدیک سے دیکھنے اور چھونے کے لیے اس مختصر سے رسالے کا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔ یہ صرف میرا اپنا ذاتی خیال نہیں بلکہ ''انقلاب اسلامی ایران'' کے پیچ و خم اور اس کے فلسفہ کے ماہر و شناسا پروفیسر حامد الگار کا بھی یہی کہنا ہے۔

انقلاب اسلامی ایران اور اس کے بے مثال قائد حضرت امام خمینیؒ دُنیائے اسلام و مستضعفین عالم کے لیے جس قدر باعث شرف و برکت و سرفرازی ہیں اُتنے ہی مظلوم و مقہور و عبرت و حسرت کا نمونہ ہونے میں بھی وہ آپ اپنا جواب ہیں اور وہ یوں کہ آج کے روشنی یافتہ ترقی پسند آزادیٔ انسان کے دَور میں بھی ذرائع ابلاغ و وسائل، رسل و رسائل کی فراوانی کے باوجود یہ دُنیا نہ انقلاب اسلامی کی کامیابی کے پہلے اس اسلامی تحریک اور انقلاب سے آگاہ تھی اور نہ اس کے طویل و خونچکاں ماضی سے واقف اور نہ اسے اس انقلاب کی محکم و سازش ناپذیر

قیادت کا کوئی ادراک تھا حتیٰ کہ ۱۹۷۸ء میں جب اس تحریک نے خونِ ناحق کی دھاروں سے سرزمین ایران کو سرخ سمندر میں بدل دیا تب بھی غیر تو درکنار اُمت اسلامیہ اور عام مسلمان اس کی پرچھائی سے دُور تھے۔ اگر کچھ جانتے بھی تھے تو وہی جو معدوم شاہ کی ساختہ پرداختہ اخباری مشینری بتاتی تھی یعنی ''اسلامی مارکسسٹوں کی شورش'' یا استعمار سرخ و سیاہ کا گٹھ جوڑ، شرق و غرب کے تمام ذرائع ابلاغ شاہ کے زیردست تھے اور اسلامی دنیا بھی اسی کو سچ مان لینے میں اپنی بھلائی و ادائیگیٔ فرض جانتی تھی حالانکہ حقیقت کچھ اور ہی تھی، لیکن انقلاب کے بعد اس کی کچھ خاص امتیازی خصوصیات سامنے آئیں۔

۱۔ ملت ایران نے پہلی بار خود کے تئیں دُنیائے اسلام کا ایک حصہ ہونے کا اعلان کیا۔

۲۔ قومی بورژوا حکومت اور اس سے وابستہ ہر گروہ کی نفی کی۔

۳۔ اسلامی بنیادوں پر حکومت اسلامی کی تشکیل مصمم ہوئی۔

۴۔ ایران کے تمام گروہوں اور سیاسی و مذہبی جماعتوں کو اس تحریک میں شامل کیا گیا۔

۵۔ بڑی طاقتوں اور ملک کے اندر موجود ان کے عوامل سے ان کا مقابلہ اور ٹکراؤ ہوا۔

۶۔ ہر بات میں عالم اسلام کے مفاد کو سامنے رکھا گیا۔

۷۔ ایسی قیادت و رہبری کی تلاش کرلی گئی جو کسی خاص گروہ یا مخصوص طبقہ کے مفاد کا پاسدار نہ ہو۔

امام امت کی رہبری کی انفرادیت یہ تھی کہ ان کے پاس نہ کوئی اخبار تھا نہ جدید دَور کی تبلیغ کا کوئی وسیلہ۔ گذشتہ کئی صدیوں کے رہبروں کے درمیان اس صنف میں امام خمینیؒ اور اسلامی انقلاب کے دیگر رہنما تنہا نظر آتے ہیں۔ انقلاب فرانس، انقلاب روس و چین، اٹلی، ہند و الجزائر سب کے پاس ضعیف یا ضعیف تر یا قوی ذرائع ابلاغ رہے ہیں حتیٰ کہ انقلاب مشروطہ کے دَور میں بھی ایران کے باہر کئی اخبارات شائع ہوتے تھے۔ کلکتہ (ہندوستان سے شائع ہونے والا اخبار حبل المتین اس کی ایک مثال ہے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد تو ہر چہار جانب سے معاندانہ پروپیگنڈہ کی برسات شروع ہوگئی اور سب کی کوشش یہی رہی کہ اس انقلاب کی آگ کو بجھا دیا جائے اور اسے منحرف کردیا جائے۔ اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو اسے محدود کر کے مقامی و مسلکی بنا دیا جائے اور اس کے رہبر عظیم کو عام مسلمانوں اور دنیا کی نظروں میں منفور کردیا جائے۔

حضرت امام خمینیؒ کی بے مثال قیادت کا تجزیہ اگر ان ہی کے اقوال و افکار کی روشنی میں کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ ان کی بھاری بھرکم قیادت اور عوام کے بے مثل فداکارانہ جذبہ کو دیکھ کر مادّی دُنیا کے پرستاروں کی عقل دنگ اور زبان گنگ رہ گئی۔ مغربی ممالک، امریکہ و اسرائیل میں انقلاب اسلامی اور امام خمینیؒ کی قیادت کئی سال تک بحث و تحقیق و تجزیہ کا موضوع بنی رہی، مگر ابھی تک وہاں کے لال بجھکڑ کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اسی طرح حضرت امامؒ کی زندگی میں ان کے آئندہ اقدام کا اندازہ لگانے میں ماڈرن آلات بھی کند ہوگئے۔ وجہ یہ کہ امام خمینیؒ کی قیادت کی بنیاد ایمان وتقویٰ پر استوار و قائم ہے۔ ولایت فقیہ کا مطلب ہی ہے متقی علماء کی حکومت۔ تقویٰ کیا ہے اور متقی کون ہے۔ مختصر یہ کہ تقویٰ ہر انسانی فضیلت کا سرچشمہ بھی ہے اور سرتاج بھی۔ دنیا میں حبِ جاہ اور ہر دُنیاوی حرص وخوف سے دُوری مگر اللہ سے بے انتہا خوف وخشیت، نالۂ نیم شبی اور آہ صبح گاہی کے کاسہ میں نجات وغفران کی طلب ہی متقی قائدوں کا سرنامہ امتیاز ہے اور یہ قیادت پیغمبروں کا خصوصیت و سیّد النّبیینؐ و امام المتقینؑ کی میراث ہے۔ ان کی قیادت دین کے خطوط پر ہوتی ہے اسی لیے ان کی سیاست اور ان کے دین میں جدائی نہیں ہوتی۔ امام خمینیؒ نے اپنے پیشرو علمائے حق مثلاً سیّد حسن مدرّس کی طرح اسے عمل و کردار سے ثابت کردیا۔ وہ اپنی عمر کے بیشتر حصہ میں صرف پیشوائے دین، مرجع تقلید، روحانی رہنما، حوزہ علمیہ کے معلم اعلیٰ زینت مسند اجتہاد اسلامی کا آغاز بنے۔ یہی تیاری و مشق بھی شہر علم قم اور مدرسہ فیضیہ و حسینیہ و مساجد میں ہوئی۔ عملی سیاست کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد مسلسل دس سال تک امامؒ نے انتہائی پیچیدہ، وحشت ناک اور پرخطر حالات

اور مصائب و ابتلا کے دور یعنی داخلی شورش و بھیانک دہشت گردی و ہولناک جنگ تحمیلی کے زمانے میں اپنی فہم و فراست، قدرت و طاقت و مقبولیت کے سکے دوست و دشمن کے دلوں پر بٹھائے لیکن ساتھ ہی ساتھ مذہبی کاروبار اور تعلیم و تعلم حوزہ علمیہ، مجلس فتویٰ کو بھی بے انتہا فروغ دیا۔ ایران اور ایران سے باہر تبلیغات اسلامی کا جال بچھا دیا جس سے آج حقیقی اسلام کا اُفق وسیع و روشن تر ہو رہا ہے اور یہ آواز ہر جانب سے آرہی ہے کہ اسلام ہی انسان کی ہر جائز خواہشات و ضروریات کی مکمل خانہ پری کر سکتا ہے۔

پہلے یہ اشارہ کیا جا چکا ہے اور اسے صاف لفظوں میں یہاں کہنا مناسب ہے کہ حضرت امام خمینیؒ کا ہر عمل تکلیف شرعی کے تحت ہوتا تھا۔ چاہے وطن ہو یا جلا وطنی، قیادت ہو یا عوامی و انفرادی حیثیت۔ چنانچہ جب نجف اشرف سے آپ نے اپنا اخراج منظور کیا تو یہی کہا کہ یہ میری تکلیف شرعی کا تقاضہ ہے۔ اسی طرح جنگ تحمیلی کو مردانہ وار جھیلا تو بھی شرعی ذمہ داری جان کر، اسی لیے سخت سے سخت مصیبت کے عالم میں بھی ان کے قدموں میں لرزش نہیں پیدا ہوئی خواہ وہ پردیس میں ان کے جوان و صالح و قوت بازو بیٹے کی اچانک و پراسرار موت ہو یا دل کے ٹکڑوں اور پارۂ تن کی دلخراش شہادت یا بہتر جاں نثاروں کی یکبارگی و اجتماعی شہادت، صبر و استقامت کے ساتھ وہ صرف خود ایسے حالات میں مثل کوہ جمے نہیں رہے بلکہ امت کو حوصلہ و توانائی بھی بخشتے رہے۔ ہر مصیبت کے مستقبل کو چیر کر ان کی مومن نگاہیں خوشگوار مستقبل کو دیکھ لیتی تھیں اور وہ اسے بشارت بنا کر عوام کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ یہ بات بھی ان کو تمام رہبروں سے ممتاز کرتی ہے۔ عراق کی بعثی حکومت نے جب اچانک بیس ڈویژن کا لشکر اور ٹینک و توپ خانے کو ہزاروں کلومیٹر ایران کی سرحد کے اندر داخل کر دیا تو عام اختشار و بوکھلاہٹ کے ماحول میں امامؒ نے صدا دی کہ یہ "جنگ نعمت ہے" یہ جنگ ملک و سرحد کے لئے نہیں بلکہ اسلام کے خلاف ہے اور جمہوری اسلامی کو نابود کرنے اور انقلاب اسلامی کو برباد کرنے کے لیے ہے۔ اس لیے دشمن کا مقابلہ ملت کے ایک ایک فرد پر واجب ہے۔ اس

صدائے غیبی کا بلند ہونا تھا کہ ساری امت اسی طرح میدان جہاد میں کود پڑی جیسے انقلاب کی کامیابی کے لیے اور اسلامی حکومت کی تشکیل کے لیے میدان میں اُتری تھی اور چند ہفتوں کے اندر عالمی امپریلزم کے خواب تار تار ہو گئے تھے اور جنگ کا پانسہ پلٹ گیا تھا۔

عام رہبروں اور قائدوں کے یہاں یہ بات دیکھی گئی ہے کہ وہ لوگ دورانِ انقلاب اور تحریک آزادی کے شباب کے دور میں پرجوش تقریر، اشتعال انگیز تحریروں کا استعمال کرتے ہیں۔ خفیہ ریڈیو اسٹیشن، پمفلٹ و اخبار سے کام لیتے ہیں لیکن امام خمینیؒ نہایت سکون کے ساتھ اپنا کام کرتے ہیں اور پندرہ سال کی جلاوطنی میں امت کو اس قدر جوش و جذبۂ ایمان سے بھر دیتے ہیں کہ ان کو تاریخ اپنا سرمایۂ افتخار بنا لیتی ہے۔ کوئی یقین کرے یا نہ کرے امام خمینیؒ نے ۱۹۷۸ء تک نجف اشرف میں رہ کر کسی اخبار کی بات نہیں سنی، صرف مشہور فرانسیسی اخبار ''لی مونڈ'' کا نمائندہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اور اس نے امام کا پہلا انٹرویو اپنے اخبار میں شائع کیا۔ کیونکہ امام خمینیؒ اخبارات کے غلط رویہ سے ہمیشہ نالاں رہے اور ان کی بات بالکل سچ تھی۔ اس انٹرویو میں امامؒ نے سب کچھ کہہ دیا ہے اور انقلابی حکومت کے خدوخال بھی واضح کر دیئے ہیں اور آپ نے جو کچھ کہا اس میں تاحیات یعنی انقلاب کے بعد بھی سرمو فرق نہیں آیا۔ اب لازم ہے کہ میں یہاں پر انقلاب اسلامی اور اس کی قیادت کی اس انفرادیت کا ذکر کروں جو سورج کی طرح روشن ہے اور اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ حضرت امامؒ نے تبلیغات اور اپنے پیغام کی اشاعت صرف اپنے ملک و ملت کے لوگوں کو سونپی اور یہ سلسلہ نجف سے پیرس تک جاری رہا۔ امامؒ کے فرمودات کو ٹیپ کر لیا جاتا تھا پھر ٹیلی فون کے ذریعہ اسے ایران پہنچا دیا جاتا جس کے بعد ہزاروں لاکھوں کیسٹ ملک کے چپہ چپہ میں پھیل جاتے تھے اور یہ طریقہ انتہائی مؤثر و کامیاب رہا اور بے مثال بھی۔

ہر انقلاب کے لیے ابتدا سے ایک گروہ مصیبت بن جاتا ہے اور اس سے نمٹنا دشمنوں سے لوہا لینے سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کے زمانے کے منافقین سے لے کر آج کے

درباری علماء کا ایک مربوط سلسلہ ہے۔ دوسری اصطلاح میں انقلاب اصلی اور انقلاب نقلی کے گروہ کا تصادم نہایت خطرناک ہوتا ہے اور کبھی کبھی انقلاب اصلی کی شکست بھی ہوجاتی ہے جیسے کہ انقلاب مشروطہ ایران ۱۹۰۶ء اور ہندوستان میں جے پرکاش نرائن کے انقلاب ۱۹۷۷ء کا انجام ہوا۔ چین میں ان دونوں گروہوں میں تیس سال تک خونریزی ہوتی رہی۔ لینن کے بعد انقلاب روس اسٹالین ایسے بدخو اور سفاک انسان کے ہاتھ میں آیا جس نے لاکھوں آدمیوں کو مولی گاجر کی طرح اُڑا دیا لیکن یہ حضرت امام خمینیؒ کی رہبری و قیادت کا کمال اور انفرادیت تھی کہ جنگ تحمیلی کے دور میں منافقین اور انقلاب دروغین سے وابستہ کے مختلف گروہوں کو آہستہ آہستہ اس طرح ختم کردیا گیا کہ آج ان کے نام لیوا بھی نہیں رہ گئے۔

امام خمینیؒ کی سادگی مشہور ہے اور اس میں کسی وقت بھی تبدیلی نہیں آئی۔ بعض لوگ اس کے مقابلے میں چند دیگر رہبروں کی مثال بھی پیش کرتے ہیں جس سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مگر امامؒ کی سادگی کا کمال یہ ہے کہ ان کے یہاں صرف غذا ولباس و مکان ہی کی سادگی نہیں بلکہ گفتگو، تحریر، فکر ونظر، طرز و ادا ہر شئے میں سادگی تھی اور اس کی وہ دوسروں کو تلقین بھی کیا کرتے تھے۔ مثلاً جب آپ پندرہ سال کی جلاوطنی کے بعد کروڑوں افراد کے استقبال کے ساتھ تہران آئے تو پہلی منزل قبرستان بہشت زہرا قرار دی۔ وہ خود کو نہ عالم کہلانا پسند کرتے تھے نہ رہبر۔ وہ پاسداروں کے ہاتھ چومتے تھے، وہ شہادت کی آرزو کرتے تھے اور برادر کہا جانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ ان کو یہ بھی اچھا نہیں لگتا تھا کہ ان کی تصویریں بکثرت شائع ہوں۔ وہ بے انتہا پابند وقت اور تہجد گزار تھے اور دوسروں کو اس کی نصیحت کرتے تھے۔ اتنی مصروفیت اور بلند مقام پانے کے بعد بھی عام لوگوں کا کام کرنے میں ان کو کوئی انکار نہ تھا۔ نکاح خوانی، استخارہ، دستار بندی، قرآن خوانی، قرآن و دینیات کی تعلیم ایسے کام بھی مرحوم امامؒ نے اپنی عظیم رہبری کے پرآشوب دور میں کمال انبساط و آمادگی سے انجام دیئے ہیں حتیٰ کہ اپنی چھوٹی بہو کے اصرار پر امامؒ نے بہت سی عرفانی غزلیں بھی کہی ہیں جو اگرچہ علم ومعرفت کا

ایک سمندر ہیں لیکن میرے خیال میں یہ بھی ایک رہبر قوم کے لیے انسان دوستی و دلداری کا ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعری فکروغور ونظم کے لیے وقت ومحنت چاہتی ہے اور ایسا رہبر جس کی زندگی کا ہر لمحہ تاریخ کی ایک صدی پر بھاری ہو وہ اپنا قیمتی وقت محض اپنے عیال کا دل رکھنے پر صرف کردے بہت بڑی بات اور سبق آموز واقعہ ہے۔ امام مرحومؒ کی انفرادی سادگی یہ بھی تھی کہ وہ دوسروں سے بھی سادگی چاہتے تھے، زندگی میں بھی اور تقریر وتحریر میں بھی۔ ان کی عبارت بہت آسان وسادہ ہوتی تھی، ہر تصنع وجذبات سے عاری۔

یہ سوال اکثر اُٹھتا رہا ہے اور اس پر دنیا کے مختلف الخیال افراد نے اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ امام خمینیؒ کی کامیابی کا راز کیا تھا لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس کامیاب قیادت اور ایسی پرجوش وفداکار امت کو امام خمینیؒ نے اپنی روحانیت ومعنویت اور شب و روز کی تربیت و محنت سے تیار کیا تھا۔ انھوں نے جو کچھ کیا، کہا، دکھایا، سنایا سب کچھ کھلی کتاب کی طرح تھا اور اسلام اصلی کا پرتو۔ انھوں نے ابتدائے زندگی سے آخر تک اس پر حرف بحرف عمل کیا اور بیس تیس سال کی تعلیم وتربیت کی مشقت اُٹھا کر سینکڑوں باعمل و اخلاص وسیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند ہم خیال لوگوں کی جماعت بکھیر دی۔ تعلیم، تزکیۂ نفس اور تہذیب اخلاق کی بات تھی، تو امامؒ اس امر پر بہت رنجیدہ رہتے کہ آجکل تعلیم یافتہ افراد میں تہذیب و اخلاق سے آشنائی ختم ہوچکی ہے اور دنیا میں فساد وفحش و بداخلاقی اسی وجہ سے بڑھ رہی ہے۔ وہ ایک واحد قائد تھے جو کہتے تھے اور انھوں نے بار بار کہا کہ انقلاب اور اس کی برکتوں میں میرا کوئی ہاتھ نہیں، نہ میرا قیام ایران کی حکومت کو بدلنے کے لیے تھا بلکہ یہ خدائی کارنامہ ہے۔ ہمارا قیام صرف اسلام کے لیے تھا۔ وہ اسلام جو خالص محمدیؐ اسلام ہے نہ کہ اسلام امریکائی و انقلطی۔ اتنا ہی نہیں وہ یہ بھی کہتے تھے کہ انقلاب کسی ایک فرد کا رہین منت نہیں ہے البتہ جب تک میں ہوں عوام کی اس امانت اسلام کو مٹنے نہ دوں گا کیونکہ اسلام غریب و بے سہارا عوام کی امانت ہے اور یہی ہوا۔ انحراف پسندوں کی ہر سعی بے کار گئی اور عوام نے انھیں رسوا کر کے ان سے بیزاری کا اظہار کیا۔

جنگ تحمیلی حضرت امام خمینیؒ کی عظیم آزمائش اور خدا کی طرف سے ان کا سخت و آخری امتحان تھا جس میں وہ صد درصد کامیاب ہوئے۔ انھوں نے آٹھ سال تک نہ صرف عراق کی درندگی کا منہ توڑ جواب دیا بلکہ ساری دنیا خصوصاً امریکہ سے مقابلہ کیا اور کسی منزل پر گھٹنے نہیں ٹیکے۔ امت کے ہر فرد میں جذبۂ شہادت و دفاع کو بھر دینا اور شمع اسلام و وطن پر پروانہ وار جان نثار کرنے پر آمادہ کر دینا تمام دنیا کو انگشت بدنداں کر گیا۔ امامؒ نے صحیح معنوں میں جہادِ حسینی کا نمونہ دُنیا کی نظروں کے سامنے پیش کر دیا اور ''کل ارض کربلا و کل یوم عاشورا'' رجز کو سب کے دل و دماغ میں اُتار دیا۔ اس جنگ کے دوران بھی امام خمینیؒ کی قیادت بے مثل رہی کہ ایک ہی وقت میں وہ فوج کے اعلیٰ کمانڈر تھے تو دوسری طرف عوام کے دل و دماغ کی ڈور بھی ان ہی کے ہاتھوں میں تھی اور صحیح بات یہ ہے کہ اگر وہ زہر کا پیالہ نہ پیتے اور جنگ کو مجبوراً نہ بند کرتے تو قوم کا بچہ بچہ ان کی رضا کے لیے جان سے گزر جاتا۔ بیس برس تک جنگ جاری رکھنے کا جو نعرہ انھوں نے دیا اسے بھی عوام نے بہ سر و چشم قبول کیا اور جب جنگ بندی قبول کر لیا تو بھی سب نے سمعاً و طاعۃً کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔ یاد رکھنا چاہیے ایسے سخت و پیچیدہ حالات میں عوام اور فوج دونوں پر کنٹرول بہت مشکل امر ہوتا ہے اور اگر ایران میں امام خمینیؒ جیسا عظیم رہبر نہ ہوتا تو ملک میں انتشار و خانہ جنگی کے پھیل جانے کا سراسر خطرہ موجود تھا۔

ایک انفرادیت حضرت امامؒ کی عالمی قیادت کی یہ بھی ہے کہ اوّل و آخر، جنگ و صلح، کوشش و کامیابی ہر مرحلے پر اپنا ناطہ صرف عوام سے قائم رکھا اور ملک کے اندر و باہر کے کمزور و کچلے ہوئے عوام اور علماء ان کے مخاطب رہے۔ انھوں نے کسی بڑے سیاست داں سے نہ رابطہ رکھا نہ کسی ملک کے سربراہ کی طرف آنکھ اُٹھا کے دیکھا نہ خود کسی متکبر حکمراں سے ملے نہ اس کے پاس گئے اور یہیں پر امام خمینیؒ و سیّد جمال الدین اسدآبادی کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔ اوّل الذکر نے عوام کے نچلے طبقہ کو نظر میں رکھا اور ان کی تربیت کر کے ان سے کام لیا اور موخر الذکر کا تعلق خواص کے طبقے یا فرمانروایانِ مملکت و رہبرانِ سیاسی و دینی سے تھا۔ امام خمینیؒ

نے اگر سربراہانِ مملکت کو خطاب بھی کیا تو برائے نصیحت۔ وہ فرمانرواؤں سے کہتے تھے کہ اپنے عوام کے ساتھ عدل و انصاف سے کام لو، ان کا حق دو۔ اسلام کی ترازو پر اپنے اعمال کو تولو، ان کی آزادی کو سلب نہ کرو اور عوام سے یہ کہتے تھے تم اپنی طاقت کو جانو، اپنی شناخت کے لیے قیام کرو اور اپنا حق لینے کے لیے برائے خدا اُٹھ کھڑے ہو۔ علماء سے کہتے تھے کہ وسائل و امکانات نتیجہ وثمر کی پروا کیے بغیر عمل کے میدان میں پیغمبرؐ کی طرح آ جاؤ۔ ہمت کرو تو خدا بھی مدد کرے گا۔ اسلام کی فریاد کو پہنچو، قرآن کی فریاد سنو۔ یہی آواز ۱۵ خرداد ۱۳۴۲ ھ ش کو امامؒ نے مدرسہ فیضیہ سے لگائی تھی اور شاہ کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ تو اسلام وقرآن سے دشمنی ختم کردے، اسرائیل و امریکہ کی دوستی سے توبہ کر۔ ہمیں تیرا تخت و تاج نہیں چاہیے بلکہ صرف اسلام وقرآن کی عزت وحرمت کو واپس لانا منظور ہے۔

اسرائیل سے معدوم شاہ کی بے انتہا وابستگی امام خمینیؒ کے لیے شروع سے سوہانِ روح بنی رہی ہے اور وہی از ابتدا تا ایں دم واحد مسلم قائد ہیں جنھوں نے اسرائیل کو امریکہ کی ناجائز اولاد کہا اور اس کو تسلیم کرنے کی ہر قیمت پر مخالفت کی بلکہ اقوامِ متحدہ سے اس کی ممبری کو ختم کرنے کے لیے پوری جدوجہد کی لیکن عرب ممالک کی دورخی پالیسی سے وہ اس نیک مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے اور امریکہ اپنی چال چل گیا۔ آج اسرائیل کو تسلیم کرنے کی باتیں اکثر عرب ممالک بے شرمی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ امام خمینیؒ اس مسئلے پر روس سے بھی ناراض تھے کیونکہ اسرائیل کی غیر قانونی حکومت کو تسلیم کرنے والوں میں وہ دوسرا بڑا ملک تھا۔ امریکہ و اسرائیل کے خلاف اگر امام خمینیؒ اپنی تبلیغ بند کردیتے تو شاہ معدوم سے ان کا اتنا شدید اختلاف ہرگز نہ ہوتا۔

اس بات کا ذکر ہم نے اس لیے کیا ہے تا کہ یہ بتایا جاسکے کہ امام خمینیؒ اقتدار پانے سے پہلے ہی عالم اسلام کے ساتھ فلسطینیوں کے ہمدرد و مددگار اور اسرائیل سے نفرت کرتے تھے۔ اخوان المسلمین کو بھی حضرت امامؒ اور ان کے پیروؤں کی حمایت حاصل تھی۔ فلسطین کانفرنس میں وہ اپنے نمائندوں کو خاموشی کے ساتھ بھیجتے تھے۔ قاہرہ میں دار التقریب المذاہب

اسلامی کی بنیاد و تصور میں وہ آیت اللہ بروجردی کے ساتھ تھے بلکہ اتحاد اسلامی کے مسئلہ میں وہ اپنے پیشرو سیّد جمال الدین اسد آبادی سے زیادہ شدت پسند تھے اور وہ وحدت کلمہ کو توحید کے ہم پلہ گردانتے تھے لیکن اس اتحاد کی بنیاد ملیت یا کسی اور چیز پر نہیں بلکہ اسلام پر تھی۔ یہ ان کا فیصلہ تھا جسے انھوں نے تحقق بخشا اور ان کی زندگی میں ان کو کامیابی ہوئی اور ''لاشرقیہ لاغربیہ اسلامیہ اسلامیہ'' کے ساتھ ساتھ ''لاشیعیہ لاسنیہ اسلامیہ اسلامیہ'' کی صدائیں تمام عالم اسلام کے گوشے گوشے میں گونج گئیں۔ یہ بھی نوٹ کرنے کی بات ہے کہ امام خمینیؒ کی صدائے اتحاد ہر حلقہ اور ہر مرحلہ کے لیے اور ہمیشہ کے لیے تھی وقتی نہیں۔ ملک و ملت کا اتحاد، شیعہ سنی کا اتحاد، مستضعفین عالم کا اتحاد، حوزہ و دانش گاہ کا اتحاد، حکومت وعوام کا اتحاد، علماء اور امت اور خود روحانیوں کے اتحاد کا مطالبہ ملت اسلامیہ میں صرف امام خمینیؒ کی دین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اسلامی وغیر اسلامی ملکوں میں اب اسلامی گروہ ایک قوی سیاسی عنصر بن کر اُبھر رہا ہے اور سیکولرزم و نیشنلزم و میٹریلزم کی دیواروں کو سیان لگ گئی ہے اور نائجیریا، اردن، مصر، الجیریا، انڈونیشیا، تیونس اور کئی ملکوں میں اسلامی جماعتوں کی کامیابی کے دروازے بالکل پاٹوں پاٹ کھل گئے ہیں اور عالمی سیاسی تسلط پر اسلام ایک قدرت مند آئیڈیالوجی کے طور پر جلوہ افگن ہو رہا ہے۔ اسلام کے نظام کو تسلیم کیا جانے لگا ہے اور ہر طرف حکومت اسلامی کا شور ہے لیکن امامؒ نے اسلام کا بھی تصفیہ و تنقیہ کیا ہے اور اسلام اصلی، اسلام حقیقی یا اسلام خالص و ناب محمدیؐ کو اسلام امریکائی و مارکسیسٹی سے الگ کیا ہے۔ علماء و روحانیت کو اسلام کا محافظ و اجر الکندہ بتاتے ہوئے ان کے احترام و رعایت کی نصیحت کے بعد بھی درباری علماء کو اسلام کے جسم کا ناسور اور متحجرین وجمود پسند علماء کو بدگوشت کہا ہے اور اس تفریق کے بعد سنّی و شیعہ کی تقسیم دم توڑ دیتی ہے اس لیے کہ دونوں فرقوں میں درباری علماء کل اور آج دونوں زمانے میں رہے اور انھوں نے دشمنانِ اسلام سے زیادہ رُوحانی لباس کی آڑ میں اسلام کو دانستہ ضرر پہنچایا ہے۔

امام خمینیؒ کے منفرد نظریۂ قیادت و اسلوبِ رہبری کا راز جاننے کے لیے مستکبرین و مستضعفین کی بازیافت پر بھی خصوصی توجہ دینا ضروری ہے جو قرآن مجید کی صدہا سال قدیم اصطلاحیں ہیں۔ امام خمینیؒ نے اپنی عملی سیاست کی بنیاد ان ہی دو زمینوں پر رکھی اور ساری دُنیا کو استکبار و استضعاف میں بانٹ کر مستضعفین کو سینے سے لگایا اور ان کی وکالت فرمائی اور استکبار کے تمام کنبے قبیلے حوالی موالی کو ٹھوکریں لگاتے رہے۔ نتیجتاً جتنا عالم استکبار ان کے خون کا پیاسا ہوتا گیا مستضعفین کا سیلِ رواں امامؒ کے حریمِ سیاست کی طلایہ گردی کرنے لگا جس کی ایک مثال نمیبیا کے سیاہ فام رہنما سام نجوما کی ہے۔ ۲۷ سال کی جلاوطنی کے بعد جب ان کو وطن جانے کا مژدہ و موقع ملا تو پہلے وہ تہران میں امام خمینیؒ کے مزار پر پہنچے اور کہا امام کے مرقد کی زیارت سے مجھے عجیب تازہ قوت ملی ہے۔

مستضعفین و مستکبرین اور ان کے گرگوں اور آلہ کاروں پر امامؒ کی نظر و توجہ برابر رہی اور اسی نظریہ کی کامیابی نے ایران کے کمیونسٹوں اور سوشلزم نوازوں کی فکری جڑیں کھوکھلی کر کے رکھ دیں اور حضرت امام رضوان اللہ علیہ کی رحلت کے چند ماہ بعد ہی نصف کرۂ ارض میں استکبارِ شرق کو مرگِ ناگہانی نے آگھیرا اور بقیہ نصف دنیا بھی اسی روش پر چل پڑی ہے۔

آخر میں امام خمینیؒ کی رہبری کی ایک معرکہ آرا صفت کا بیان بھی ضروری ہے جو ان کی ذات ہی کی طرح کمیاب یا نایاب ہے اور وہ ہے اقتدار کے مرکز ہی نہیں بلکہ دائرے سے بھی اپنی اولاد امجاد، اعزہ و اقارب و احباب کو الگ رکھنا۔ وہ خود کو خادمِ قوم کہتے تھے اسی طرح سے اپنے متعلقین سے بھی غیر سرکاری خدمتِ اسلام چاہتے تھے۔ ان کے برادرِ بزرگ، فرزندِ رشید اور بے شمار قریبی عزیزوں کی زندگی اس کی گواہ ہے۔ انھوں نے اوّل روز سے یہ طے کرلیا تھا کہ حکومت سے ان کے اپنے خاندان کا کوئی شخص فائدہ نہیں اُٹھائے گا۔ اس اصول پر حضرت امامؒ سختی سے قائم رہے اور کوئی دباؤ انھیں اس راہ سے ہٹا نہیں سکا۔

حضرت امام خمینیؒ کی ہستی اعلیٰ خصائل و بے نظیر کردار کے لحاظ سے ایک بحرِ ذخار و

دریائے ناپیدا کنار ہے۔ ان پر ابھی تک میری اطلاع کے مطابق چھوٹی بڑی سو سے زائد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور اس سے زیادہ لکھی جا رہی ہیں۔ یہ کیوں صرف اس لیے کہ ''اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ'' کی آیت ان کا سرنامۂ زندگی تھی۔ خدا کے سوا ان کو کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ نہ کوئی نظروں میں سماتا تھا۔ ہم سب سے ان کا یہی تقاضا تھا کہ جو کرو خدا کے لیے، جو سوچو خدا کے لیے ''اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ'' کا وہ جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ وہ ہر تاریخی و عظیم دن کو خصوصاً ۱۵ر خرداد و ۲۲ر بہمن کو ''یوم اللہ'' کہتے تھے، اس لیے ان کے قول کے مطابق ان کی ولادت و وفات کا دن بھی یوم اللہ ہے لیکن خود ان کو ہم کیا کہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ ''مرد اسلام'' تھے یا ''مرد قرآن''، ''مرد سال'' یا ''مرد قرن''، مرد تاریخ''، ''مرد ایران'' یا ''مرد خدا''۔ بیشک ''مرد خدا'' ہی ان کے لیے موزوں و مناسب ہے کیونکہ ان کی نظر میں یا تو خدا تھا یا پھر اس کے نیک بندے مظلوم و لاچار عوام۔

آخر میں برسبیل تذکرہ یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جس طرح حضرت امام خمینیؒ کے جملہ معتقدات و احساسات ابتدائے زندگانی سے آخر دم تک یکساں تھے اسی طرح خانۂ خدا، حج، اہمیتِ کعبہ اور اس عظیم اجتماعِ مسلمین کے تعلق سے امامؒ کے خیالات میں اقتدار و رہبری کے قبل و بعد کے دور میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور آپ رُبع صدی پہلے نجف اشرف کی جلاوطنی کے زمانے میں وہی وظیفۂ شرعی ادا کر رہے تھے جو اقتدار کے بعد آپ نے کیا یعنی حج کے اجتماع سے استفادہ اور عامۂ مسلمین کی خیر خواہی، عراق میں اگرچہ آپ نوجی و بعثی حکومت کی سخت نگرانی میں تھے لیکن جیسے ہی حج کا زمانہ قریب آتا آپ لاکھوں کی تعداد میں اپنا الٰہی و سیاسی پیغام چھپوا کر مخفیانہ طور پر سعودی مملکت میں پہنچاتے تھے۔ امامؒ کے فدائی ہر خطرہ مول لے کر اسے حاجیوں میں تقسیم کرتے تھے اور اتحاد اسلامی کی تحریک کو اندر اندر بڑھاوا ملتا رہتا تھا۔ اس پیغام میں یہی برائت عن المشرکین و وحدت مسلمین کی دعوت ہوتی تھی اور حاجیوں کو بتایا جاتا

تھا کہ حج صرف ایک رسمی اور چند مناسک کی ادائیگی کا کام نہیں بلکہ جہانِ اسلام کے مفاد و مصالح پر غور وفکر کرنے اور ان کی مشکلات کا حل ڈھونڈھنے کا محل و مقام ہے اور ہر حاجی کی تکلیف شرعی یہ ہے کہ وہ اس عظیم اجتماعِ اسلامی میں اپنا فریضہ ادا کرے، اپنا حال دوسروں کو سنائے اور دوسروں کی زبانی ان کی سماجی، معاشی، سیاسی صورتِ حال کو معلوم کر کے فکرمند ہو۔ انقلاب کے بعد اس رہبرِ اعظم نے اپنے وظیفہ ادا کرتے ہوئے اعلیٰ پیمانے پر حج کے عبادی و سیاسی پہلوؤں کو روشن کیا اور مختلف آزار و رکاوٹوں کے باوجود مسلمان امت اس پر عامل رہی۔ مکہ و مدینہ کی زمین اور آسمان وحدتِ کلمہ اور کفرشکن نعروں سے گونجتے رہے یہاں تک کہ امریکہ و اسرائیل کیلئے یہ آوازیں قاتل بننے لگیں اور انھوں نے حکومت سعودی کو مجبور کیا کہ وہ جبر وستم، ظلم و شقاوت، ہیکڑی اور فریب کے زور پر اس عظیم مشن کو اس انوکھی درس گاہ کو بند کردے اور مکہ کی مقدس زمین حرمِ امن الٰہی کو بے گناہ مسلمانوں کے خون سے رنگین کر کے ایرانی زائرین، ایرانی حکام اور رہبرِ انقلاب اسلامی کی تصویر کو عام نگاہوں میں خراب کردے لیکن امامؒ کی رحلت سے چند ماہ پہلے ہی ان کا طلسم ٹوٹ گیا۔ مسلمانانِ عالم کو دوست دشمن کی پہچان ہوگئی۔ اصل ونقل کا فرق واضح ہوگیا اور آج دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوکر اصل حقیقت سامنے آگئی ہے کہ نام نہاد پاسبانِ حرم کو حرم ومقدساتِ اسلامی سے کتنی دلچسپی ہے اور انشاء اللہ دن بہ دن تاریکی کے بادل چھٹتے جائیں گے اور جلد ہی پھر ساری دنیا کے مسلمان حج کے ایام خدائی میں مثل سابق مشرکین سے برأت اور اتحادِ اسلامی کی دعوت کا ملی فریضہ انجام دینے میں آزاد ہوں گے۔ اس وقت اس رہبرِ اعظم کی یاد ہر دل میں ہوگی اور لب پر اس کے لیے دعائے خیر ''وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔'' خلاصہ یہ کہ ان کی حیات بھی اسلام و امت کے لیے نعمت تھی اور ان کی وفات بھی۔ ان کا کام، ان کا امتحان پورا ہوا، وہ کامیاب ہوئے اور اللہ نے ان کو اپنے پاس بلا لیا۔

❁❁❁